ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

"آدمی" از عرفان جاوید: تجزیاتی مطالعہ

"Aadmi" by Irfan Javed : Analytical Study

*ڈاکٹر عبدالرحیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز، لاہور
**محمد ساجد جاوید
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
***ڈاکٹر محمد امجد عابد
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract

Man and mannerism is study focus of those literary critics who have given respect and value to humanity as social being and master piece of creation on the earth by God Almighty .Author under discussion Irfan javed has effective interaction with high caliber literary personalities and explored their attributes through insight regarding intellectualism and literary contribution.Sketch writing in literature is like sculpture making type art where brush and hammer are used to develop a pen picture, same has been performed by the author of "Naya Aadmi, Purana Aadmi" First sketch by the author is museum of aesthetics and blend of old and new which inspire the reader up to the ending of sketch .The author of this article has highlighted critically how interaction is source of learning for the generation of readers. Author's viewpoint and critical thinking skills have opened new ways to study sketch writing.

Key Words: Irfan javed, Sketch Writing, Personality, Psychology, Intellectualism, Research, Criticism, Autobiography, Relationship, Aadmi

کلیدی الفاظ: عرفان جاوید، خاکہ نگاری، شخصیت، نفسیات، عقلیت، تحقیق، تنقید، سوانح، تعلق خاطر، آدمی

"آدمی" سے قبل عرفان جاوید کی خاکوں سے متعلق دو کتابیں بالترتیب "دروازے" اور "سرخاب" کے نام سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ یہ اُن کی خاکوں پر مشتمل تیسری کتاب ہے۔ یہ 6 خاکوں، ۲۵۴ صفحات پر محیط ہے جب کہ اس کا سال اشاعت ۲۰۲۳ء ہے۔ کتاب کا انتساب بیوی اور بیٹوں کے نام ہے۔ پہلا خاکہ "نیا پرانا آدمی" کے عنوان سے آصف اسلم فرخی سے متعلق ہے جو ۳۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا "من موجی" کے نام سے اسحاق نور کے بارے میں ہے۔ جس نے کتاب کے ۴۵ صفحات کو گھیر رکھا ہے۔ تیسرا "گیبرئیل" نام سے ہے اور یہ کتاب کے ۶۳ صفحات پر مبنی ہے۔ چوتھا، پانچواں اور چھٹا خاکہ بالترتیب "خواب دیکھنے، دکھانے والا، بڑی ماموں اور بانسری بابا" کے نام سے موسوم ہیں۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے ۳۵، ۳۱ اور ۲۹ صفحات کی صورت کتاب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مزید برآں 1 مسال کراچی لٹریچر فیسٹیول میں جغادری تخلیق کاروں کی علمی و ادبی بساط کو سمیٹتے ہوئے یہی کتاب اوّل انعام کی مستحق قرار پائی۔

خاکہ ادب کی ایسی صنفِ سخن ہے جس کے ذریعے سے ماضی اور حال کے ایسے افراد سے واسطہ پڑتا ہے جن سے ہمارا عملی زندگی میں کبھی رابطہ استوار نہیں ہوا ہوتا۔ بعض اوقات زمانی اور مکانی بُعد خاکے کے کرداروں اور قارئین کے مابین حائل ہو جاتا ہے۔ جس کی بنیاد پر معاشرے کے ایسے کرداروں سے ملاقات کا ذریعہ خاکہ بنتا ہے۔ خاکہ نگاری میں جو بات سب سے زیادہ قابل قدر ہے وہ یہ ہے کہ خاکہ نگار نے اپنے خاکوں میں کس شخصیت کا انتخاب کیا ہے؟ جس کا انتخاب کیا ہے کیا لوگ اس سے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

واقف ہیں یا اُسے جاننے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ خاکہ نگار اپنے ممدوح سے کتنا ذاتی تعلق رکھتا ہے؟ اس کا تعلق جتنا قریبی اور گہرا ہو گا اس میں حقیقی رنگ اتنا ہی منفرد، جاذبِ نظر اور دل کش ہو گا۔ اگر خاکہ نگار کسی شخصیت سے قریبی تعلق نہیں رکھتا اور پھر اس کے درمیان مکانی اور زمانی بُعد بھی حائل ہے تو پھر اس صورت میں اُسے اپنے ممدوح کی سوانح حیات اور اس کے سبھی گوشوں کو باریک بینی اور عرق ریزی سے کھنگالنا ہو گا۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر غفور شاہ قاسم بیان کرتے ہیں :

"خاکہ نگاری، حلیہ نگاری بھی ہے، چہرہ نمائی بھی، پیکر تراشی بھی ہے اور کردار نویسی بھی۔ یہ شیشہ سازی کا فن ہے۔۔۔۔ خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ صاحبِ خاکہ کی شخصی گہرائی میں اُتر کر خوبیوں اور خامیوں کے موتی اور خزف ریزے نکال لانے کا ہنر جانتا ہو۔"[۱]

خاکہ نگاری کے لیے انھی معیارات کا ذکر ڈاکٹر انور سدید ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"اس (خاکے) میں مشاہدے کے حقیقی گوشے، شگفتہ اسلوب میں پیش کیے جاتے ہیں اور کردار کا بامعنی اور مثبت تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمدردی، مردم شناسی، واقعہ فہمی اور نفسیاتی آگہی اچھے خاکہ نگار کے بنیادی اوصاف شمار ہوتے ہیں۔ خاکے کا مقصد شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر کی فنکارانہ پیشکش ہے۔"[۲]

احمد عقیل روبی نے ناصر کاظمی کا کام یاب خاکہ بہ عنوان "مجھے تو حیران کر گیا وُہ" اُن کی پچیسویں برسی منعقدہ ۲۷ مارچ ۱۹۹۷ء بہ مقام الحمرا ہال نمبر ۳ لاہور میں پیش کیا جس پر بیگم ناصر کاظمی نے احمد عقیل روبی کو ان الفاظ میں سراہا۔

"ناصر صاحب کی باتیں تو سب نے کیں مگر تم نے ریزہ ریزہ ناصر کاظمی کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ عقیل روبی تمہارا شکریہ تم نے 25 سال بعد میرا ناصر کاظمی مجھے واپس کر دیا۔"[۳]

متذکرہ بالا خاکے کی خوبی یہ ہے کہ عقیل روبی نے جس باریک بینی سے ناصر کاظمی کی تصویر میں رنگ بھرے ہیں اگرچہ میں زندگی میں ان سے نہیں ملا لیکن ایک بھرپور سراپا، ان کے شخصی رویے، تاثر، نشست و برخاست، ناک نقشہ اور عادات و اطوار ایسے سامنے آگئی ہیں جیسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے ناصر کاظمی کو دیکھا ہے۔ دورِ حاضر میں جدید سہولیات سے مزین سینماؤں میں تھری ڈی (3D) ایفیکٹ اور ساؤنڈ سسٹم کے ذریعے ناظرین کسی بھی فلم کے حقیقی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ المیہ مناظر میں الم جب کہ طربیہ واقعات میں طرب سے ہم کنار بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خاکہ نگار اپنے ممدوح سے ذاتی تعلق اس کے رویوں اور کردار کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اس خوب صورتی سے اُس کی تصویر خاکے کے فریم میں جڑ دیتا ہے کہ نہ صرف مغائرت معدوم ہو جاتی ہے بل کہ اس شخصیت سے اُنسیت لگاؤ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خاکہ نگار کی تخلیقی اور فنی چابک دستی کا کمال ہی ہے کہ ماضی کی کوئی شخصیت حال کے افق پر جلوہ گر ہو کر قارئین کے دل و دماغ پر ان مٹ نقوش مرتب کرنے کا باعث بنتی ہے اور مستقبل میں بھی ادبیت کی وجہ سے سراہی جاتے ہے۔ خاکہ نگاری کے اسی پہلو پر ڈاکٹر محمد عمر رضا ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

"ادبی اصطلاح میں اس (خاکے) سے مراد وہ نثری تحریر ہے جس میں نہایت مختصر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادھے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں کسی فرد کے مختلف گوشوں کی اس انداز سے حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی جاتی ہے جس سے فرد کی مکمل تصویر آنکھ کے سامنے آجائے۔"[۴]

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

عرفان جاوید کی خاکوں کی تیسری کتاب "آدمی" ہے۔ جس کا پہلا خاکہ "آصف اسلم فرخی" کا ہے جو نیا پُرانا آدمی کے عنوان سے کتاب میں درج ہے۔ وہ خانوادۂ ڈپٹی نذیر احمد کے چشم و چراغ ہونے کے ساتھ جید ادیب و استاد اسلم فرخی کے فرزند ارجمند، انٹر میڈیٹ میں کراچی بھر میں گولڈ میڈلسٹ، ہارورڈ یونی ورسٹی سے تعلیم یافتہ، آغا خان اسپتال سے منسلک، یونی سیف جیسے ادارے سے وابستہ ڈاکٹر تھے۔ مزید بر آں وہ افسانہ ساز، مترجم، ناقد، اُردو و انگریزی کے مضمون نگار اور کراچی میں ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے۔ وہ نہ صرف مہمان نواز، جنون پیشہ، عالمی ادب کے ناقد تھے بل کہ سادہ دلی رواداری، دریادلی اور بذلہ سنجی کی بھی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ وہ جہاں اپنی ذات میں مگن رہتے وہاں آکسفورڈ ادبی میلہ کی داغ بیل ڈالنے میں بھی ان کا نام کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ عرفان جاوید نے اس خاکے میں اُن کی ادبی جہتوں کو جس خوب صورتی سے موضوع گفت گو بنایا ہے اس کے ساتھ ان کے نجی و ذاتی نوعیت کے مسائل کو بھی اُجاگر کر دیا ہے۔ ان مسائل و واقعات کو پڑھتے ہوئے ایک طرف دُکھ اور غم کی کیفیت سے انسان دوچار ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ دُکھ المیے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ آصف اسلم فرخی نے محبت کی شادی کی اور اُسے نبھانے کے لیے اپنے والدین سے الگ گھر لے کر رہنا شروع کر دیا لیکن آخری عمر میں وہ شادی بھی طلاق پر آکر منتج ہوئی تو قارئین کو ایک بھیانک خواب کی مانند دھچکا لگتا ہے اور اس کے پاس سوائے کفِ افسوس ملنے کے کچھ بھی نہیں بچتا۔

اس خاکے میں اشتیاق اور دل چسپی جس دل کشی سے گریہ میں تغیر پذیر ہوتی ہے وہ ملاحظہ ہو:

> "ایک شام انھوں نے مجھے فون کیا تو ان کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی، انھوں نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ان کے گھر آنے کا کہا تو انھوں نے مجھے حبیب یونی ورسٹی بلا لیا۔۔۔۔۔یونی ورسٹی میں ہم دونوں کیفے ٹیریا میں جا بیٹھے۔ ان کا چہرہ چند روز میں ڈھلک گیا تھا اور آنکھوں کے نیچے حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ میں نے تشویش سے اُن کی صحت کا پوچھا تو وہ بولے 'مجھے آپ سے کام ہے۔ آپ ذکیہ سرور (میرے ہمسائے میں رہنے والی بزرگ و شفیق خاتون) سے بات کیجیے۔ میری اور سیمیں کی طلاق ہو گئی ہے، میری کتابیں وہاں رکھی ہیں اور میں اپنی کتابیں لینا چاہتا ہوں' ۔۔۔۔انھوں نے بتایا کہ اُن کے پاس پہننے کو اس جوڑے کے سوا کپڑے بھی نہ تھے جو وہ پہن کر گھر سے نکلے تھے۔ انھوں نے نئے کپڑے بھی بازار سے خریدے تھے۔"[۵]

روز مرہ زندگی میں شادیوں کی ناکامی ان کے اوّائل میں ہی رُونما ہو جاتی ہے لیکن یہ بات جہاں حیرت انگیز ہے، وہاں کرب ناک کیفیت سے بھی دوچار کر دیتی ہے کہ اُن کی بچیوں کی نہ صرف شادیاں ہو چکی ہوتی ہیں بل کہ وہ نانا، نانی کہلوانے کے بھی سزاوار ہو چکے تھے۔ اُن کی کم مائیگی، کس مپرسی، بے بسی اور بے چارگی کی تصویر میں درج ذیل الفاظ کی ادائی سے وہ اپنا مُوئے قلم توڑ دیتے ہیں اور قاری عجیب مخمصے کا شکار ہو جاتا ہے کہ یہاں رونا بنتا ہے، ہچکیاں لینا صحیح ہے یا یہاں سر پیٹنا چاہیے۔

> " بہر حال میں نے ذکیہ صاحبہ سے بات کی، آصف صاحب کی شادی شدہ اور بیرون ملک آباد بیٹیاں بیچ میں پڑیں اور آصف صاحب کو اُن کی کتابیں اور دیگر اشیا مِل گئیں۔ گھر کا پلاٹ بیگم کے نام تھا، بنگلہ بیگم اور آصف صاحب نے مل کر بنوایا تھا جس میں زیادہ حصہ اُن کی بیگم کا تھا۔ سو وُہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی حالت ان بے گھر بلیوں کی سی ہو رہی تھی جو خاموش راتوں میں گلیوں میں روتی پھرتی ہیں اور اُن کا گریہ فضا میں گونجتا رہتا ہے۔"[6]

آصف فرخی نے جس جواں مردی سے حالات و واقعات کا مقابلہ کیا وہ اپنی جگہ قابلِ داد تو ہے ہی اس کے ساتھ عرفان جاوید نے اپنی جزئیات کے ذریعے اس خاکے میں حقیقت نگاری کا جو رنگ بھرا ہے وہ نہ صرف لائقِ تحسین ہے بل کہ قابلِ ستائش بھی ہے۔ بہ قول رحمان فارسؔ:

کہانی ختم ہوئی اور ایسے ختم ہوئی
کہ لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

اس کتاب کا دوسرا خاکہ "اسحاق نور" کا ہے جسے "من موجی" کا نام دیا گیا ہے۔ وہ گجرات کے نواحی گاؤں میں ایک کمھار گھرانے میں پیدا ہوا۔ میٹرک کی تیاری کے لیے راول پنڈی میں داخلہ لیا اور امتحان گجرات آکر دیا۔ میٹرک میں کم نمبر آنے پر ایم۔ اے۔ او کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ انھیں تعلیم کے لیے گھر سے کوئی ماہانہ خرچہ تو ملتا نہیں تھا اس لیے تعلیم جاری رکھنے کے لیے انھوں نے مختلف کام کیے جیسے میڈیکل اسٹور میں، پی۔ آئی۔ اے میں انجینرنگ ٹیکنیشن کی نوکری۔ اس کے علاوہ انھوں نے ٹنڈو آدم میں اگربتی کا کارخانہ بھی لگایا۔ مزید برآں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے رکشے بھی دھوئے اور بازارِ حسن کے گلوب ہوٹل میں بیرے کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ اس نے بائی کے ہاں ملازمت بھی کی اور اُن لوگوں کی زندگی اور اس نوعیت کے خرخشوں کو بھی بہت قریب سے دیکھا۔ اس نے اپنے سیلانی مزاج کی بہ دولت جہاں زمانے کے نت نئے رنگ دیکھے وہاں ثقافتی زندگی کو جاگتی آنکھوں اور بہ قائمی ہوش و حواس محسوس بھی کیا۔ اسحاق نور کا اصل میدان علومِ نجوم اور ستارہ شناسی تھا۔ جس نے انھیں "کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی" کے مصداق نہ صرف مشہور کر دیا بل کہ منفرد اور ممتاز مقام بھی دلوانے کا باعث بنا۔ اس ضمن میں عرفان جاوید لکھتے ہیں کہ:

> "اُس وقت پاکستان پر جنرل ضیاء الحق مطلق العنان حکم ران تھے اور ریاستی اہل کار ان کے اشارہ ابرو اور جنبشِ سبیل (مونچھ) کے منتظر رہتے تھے۔ محمد خان جونیجو وزیر اعظم تھے اور علامتی سے حقیقی منتظمِ اعلیٰ کی جون میں بہ تدریج آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان حالات میں جنرل ضیاء الحق کی گرفت آہنی تھی اور حکم رانی کا سورج ان کی پیشانی پر چمک رہا تھا تب اس زائچہ نویس نے اگلے ماہ یعنی 1986ء میں معروف جریدے "دی تھرڈ ورلڈ" کے لیے ایک مضمون لکھا اور پیش گوئی کی کہ بے نظیر بھٹو گیارہ نومبر 1988ء کو وزارت عظمیٰ کا حلف اُٹھائیں گی۔ تب اس پیش گوئی کو ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ حیران کن طور پر بے نظیر بھٹو نے ۱۷ نومبر 1988ء کو وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔ یعنی پیش بینی اور حقیقت میں فقط چھ روز کا فرق تھا۔"[۸]

اسی طرح 1998ء میں جنرل پرویز مشرف اور میاں نواز شریف کے مشترکہ دوست اسحاق نور کو منگلا مشرف کے پاس لے گیا۔ تب مشرف منگلا کے کور کمانڈر تھے۔ مشرف نے دریافت کیا کہ کیا وہ چیف آف آرمی سٹاف بن جائیں گے۔ اس نے اپنے حساب سے بتایا کہ وہ انھیں پاکستان کے صدر کے طور پر دیکھ رہا ہے جس پر مشرف نے نہ صرف اُسے سگار سلگا کر پیش کیا بل کہ کھانا بھی کھلایا۔

اس نے اپنے سیلانی مزاج کی وجہ سے نہ صرف بھانت بھانت کی معلومات اکٹھی کیں بل کہ وہ ایک چلتا پھرتا معلومات کا ایک خزانہ بھی تھا۔ اُس نے پنجاب کی بجائے چترال میں جا کر شادی کی جس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ پنجاب کی عورتیں مزاج کی تیز ہوتی ہیں اور ان میں برداشت کا مادہ بھی کم ہوتا ہے اس کے برعکس چترال کی عورتیں خدمت گار اور شوہر پرست ہوتی ہیں کیوں کہ وہ جس سیلانی مزاج کا مالک تھا اس کے ساتھ پنجاب کی عورتوں کا نبھاذرا مشکل سے ہوتا۔ اسے سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت تھی۔ دُنیا جہاں کی سیر کر کے جب وہ اپنی ماں سے ملتا تھا وہی اس کی زندگی کا سکھ بھرا لمحہ ہوتا تھا۔ اُس نے دنیا بھر کے لوگوں کا حساب لگایا لیکن وہ اپنا حساب لگاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مجھے واثق یقین ہے کہ وہ اپنا حساب لگا کر روانگی کا لمحہ سمجھ چکا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے لیپ ٹاپ سے دُور ہو گیا اور کورونا کے آتے ہی راہی ملکِ عدم ہوا۔

اس کتاب کا تیسرا جان دار خاکہ گیبر ئیل کا ہے جو سوئٹزر لینڈ کا باشندہ ہے جس سے مصنف کی ملاقات استنبول میں سیر و سیاحت کے درمیان ہوئی ۔ پولیس نے مصنف کو پاسپورٹ نہ ہونے کی بنیاد پر جیل جانے کو کہا اس پر گیبر ئیل نے نہ صرف خود جیل جانا پسند کیا بل کہ پولیس والوں کے جیل سے بچنے کے لیے رشوت طلب کرنے پر بالکل انکار کر دیا۔ وہ سنگل پیرنٹ کی اولاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ ہی اُسے اور نہ اُس کی ماں کو معلوم ہے کہ اس کا باپ کون تھا؟ اس کی ماں ہپی تحریک سے متاثر تھی جب کہ اس کا نانا پرانی اقدار کا علم بلند کیے ہوئے تھے۔ اس کی ماں کہاں تھی ، یہ اُسے بھی معلوم نہیں تھا۔ ہپی تحریک پر عرفان جاوید ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں :

> "ہپی مروجہ اداروں کو نہیں مانتے تھے، معاشرتی اقدار کے خلاف، نیو کلئیر ہتھیاروں کے مخالف، جنسی آزادی کے داعی تھے، سبزی خور تھے، ماحولیاتی آلودگی کے دشمن اور ماحول دوست، ادب و فنون میں اختراعات کرتے تھے، گلی محلے کے تھیٹر کے حامی تھے، لوک موسیقی سنتے ،

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

منشیات بے دریغ استعمال کرتے تھے جو انھیں متوازی اور ماورائی احساسات کو رجوع کرنے میں معاون ہوتی تھیں۔ نہاتے نہیں تھے اور نہ بدنی صفائی پر توجہ دیتے تھے۔ پوری دنیا کو ایک کمیونٹی سمجھنے کے ساتھ ساتھ باہمی روابط اور تعلقات رکھنے کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شادی کا بندھن حسد اور دوسرے انسان پر اختیار کر کے جذبات کو جنم دیتا ہے جو شخصی آزادی کے خلاف ہے، بالخصوص یہ عورت کو قید کرتا ہے۔ گیبر ئیل ہپی تحریک کا بیٹا تھا۔"۹

گیبر ئیل نے آزاد زندگی بسر کرنے کے لیے مختلف نوع کے کام سیکھ رکھے تھے وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتا جہاں اس کا دل کرتا وہ صبح گزارتا اور جہاں اس کا جی آمادہ ہوتا شام بسر کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ نوادرات کے کاروبار میں دل چسپی لے کر دھوکہ کھا جاتا تو کہیں ہوٹل میں مینجر کے طور پر کام کرتا۔ وہ ایک گھڑی بنانے والی کمپنی میں بڑے اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا لیکن آزاد زندگی کا سودا اُس کے دماغ میں سمایا ہوا تھا اس لیے اُس نوکری کو بھی خیر آباد کہہ کر ویسی ہی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی جیسی زندگی اُس کی ماں گزار رہی تھی۔ ان سب کے باوجود اس میں بے لوث محبت، انسانی ہم دردی اور خلوص و وفا کا جذبہ بدرجہ اُتم موجود تھا۔ اس کا واضح ثبوت یہی تھا کہ اُس نے مصنف کو رخصت کرتے وقت اپنے گلے میں لٹکنے والی اکلوتی سونے کی زنجیر تحفہ کے طور پر دے دی تھی۔ جس کا ذکر ان کے خاکے میں کچھ یوں درج ہے۔

"جہاز میں بیٹھ کر میں نے اپنے دستی بیگ سے وہ پارسل نکالا اور کھولا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ اُس محنت کش سیاح، میرے دوست، میرے بھائی گیبر ئیل نے اپنا سب سے قیمتی، اپنا واحد اثاثہ، اپنی سونے کی چین مخملیں کپڑے میں لپیٹ کر مجھے تحفہ کر دی تھی۔۔۔۔۔ عمرِ گزشتہ پر نظر کرتا ہوں تو بے چہرہ لوگوں کا ہی ہجوم نظر آتا ہے جس میں چند لوگ ہی چہرہ رکھتے ہیں، ان میں ایک نمایاں دمکتا ہوا چہرہ گیبر ئیل کا ہے۔ گورے چٹے چہرے کے گرد ایک سنہرا ہالہ ہے، معصومیت اور محبت کا۔"۱۰

یہ سچ ہے کہ خلوص اور بے لوث محبت اگرچہ بظاہر نظر نہیں آتی لیکن اس کے دل و دماغ پر اثرات نہ صرف دیرپا بل کہ لازوال بھی ہوتے ہیں۔ اس محبت کے اثرات اور اس کی آواز صدیوں بعد بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ جن لوگوں نے رنگ و نسل، مذہب و ملت کی تمیز سے بالاتر ہو کر بلا تخصیص انسانیت کی خدمت کی ہے وہ ہر طبقے میں دلی احترام پانے کے ساتھ ساتھ سراہے بھی جاتے ہیں۔ وُہ مدر ٹریسا ہو، عبدالستار ایدھی ہو یا روتھ فاؤ یا اس طرز کی کوئی اور شخصیت ہو وہ افراد کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں اور ذہنوں پر حکومت کرتی ہیں۔

"خواب دیکھنے اور دکھانے والا" کے عنوان سے لکھا گیا خاکہ مطیع الرحمان کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اس کتاب کا چوتھا خاکہ ہے۔ مطیع الرحمان کا تعلق لاہور کے علاقہ ساندہ سے تھا۔ اس کی پیشہ وارانہ زندگی تو انشورنس ایجنٹ کی تھی لیکن اس نے پامسٹری شوقیہ طور پر اختیار کی اس میں ایسی مہارت بڑھی کہ انشورنس والی نوکری پیچھے رہ گئی اور موخر الذکر کام ہی ان کی شہرت اور روزی روٹی کا وسیلہ بنا۔ مطیع اپنے کلائنٹوں کے حالات و واقعات جاننے کے بعد اُن کے ہاتھ کا فرضی خاکہ اس مہارت اور درستی سے تیار کرتا تھا کہ لوگ انگشتِ بدنداں رہ جاتے۔ اس ضمن میں عرفان جاوید لکھتے ہیں:

"ایک روز ایک معروف انگریزی اخبار کی مدیرہ کا فون آیا۔ انھوں نے مطیع کا انٹرویو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ نجوم، دست شناسی، رمل وغیرہ کے ماہرین کا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا علم کتنا حقیقی اور سچا ہے اور کتنا بے بنیاد۔ یہ سُن کر مطیع نے ٹھان لی کہ وہ بہر حال اپنے علم کو ثابت کرے گا۔ اُس نے مدیرہ کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں۔ انھی کی بنیاد پر اس کے ہاتھ کا خیالی خاکہ بنایا اور میاں میر پل کے نزدیک اُن کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے مدیرہ کے سامنے اُن کے ہاتھ کا خاکہ رکھا۔ تمام لکیریں حقیقی لکیروں کے قریب تھیں، البتہ حیران کن طور پر خطِ زندگی کے قریب زہرہ کے ابھار پر نمایاں طور پر بنایا گیا سیاہ دھبا حقیقی ہاتھ کے متعلق ابھار پر تل سے مماثلت رکھتا تھا۔ مطیع کا انٹرویو اگست ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس میں مدیرہ نے اس کے خیالی خاکے کی حقیقی ہاتھ سے مماثلت کو سراہا تھا۔"۱۱

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

وہ یار باش ہونے کے علاوہ مختلف علوم وفنون سے بھی دل چسپی کے ساتھ عالمی ادب کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔ اُسے شکار کرنے، کوہ نوردی، لاہور کے عجائب گھر میں بدھ آرٹ کے مطالعہ کے ساتھ اس کے ماہرین سے تبادلہ خیال کرنے میں بھی لطف آتا تھا۔ ان سب کے باوصف اس نے کئی درست پیشین گوئیاں بھی کی۔ آخر کار مطیع الرحمان بھی زندگی کی محرومیوں، بیوی کی وفات کا صدمہ اور بچوں کے خوب صورت اور تاب ناک خواب دیکھنے کی تگ ودو میں دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ عرفان جاوید نے اپنے ممدوح کی زندگی کی جزئیات کو جس ژرف بینی سے اپنے خاکے میں بیان کیا ہے وہ لاجواب ہونے کے ساتھ ساتھ موثر اور اداس کر دینے والی بھی ہیں۔ اس خاکے کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

"میں نے عامر میاں سے پوچھا کہ اگر مطیع کو چند الفاظ میں بیان کرنا چاہے تو کیا کہے گا۔ اس نے کہا 'ترسا ہوا آدمی'۔ بے شک وُہ ایک محبت اور توجہ کو ترسا ہوا آدمی تھا۔ شاید اس لیے بھی خواب نگر میں رہتا تھا اور لوگوں کو بھی خوش کرنے کے لیے، مسرت بانٹنے کے لیے، خواب دکھایا کرتا تھا۔"[۱۲]

بہ قول احمد فراز:

ہم ایسے سادہ دلوں کو وُہ دوست ہو کہ خدا
سبھی نے وعدۂ فردا پہ ٹال رکھا ہے

"بڑی ماموں" اس کتاب کا پانچواں خاکہ ہے جس میں ایک ایسے شخص کی داستان حیات کو بیان کیا گیا ہے جس پر کبھی رشک آتا ہے اور کبھی افسوس ہونے لگتا ہے۔ رشک اس بات پر کہ اُس نے دنیا کی زندگی کے جھمیلوں سے الگ رہ کر اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے ساتھ بتایا۔ افسوس اس بات کا، کہ اس نے اپنی بیوی اور معصوم بچے کو چھوڑ کر کبھی خبر نہ لی۔ وہ ایک آزاد مزاج آدمی تھا جو یورپ اور امریکہ کی زندگی اس کے انداز اور رویوں کا قائل تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی چار دن کی ہے لہٰذا اسے زندگی کی بندشوں اور ذمہ داریوں سے ماوراء ہو کر گزارنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے مختلف زبانیں سیکھی۔ ہوٹلنگ، کوکنگ اور مہمان داری کے کورس کیے، گویا یہ سب اُس کی آزاد زندگی کا زادِ راہ تھا۔ جس کی بہ دولت وہ اپنی مرضی کے ممالک میں جا کر اپنی روزی روٹی کمانے کے ساتھ ساتھ وہاں رہنے کا بندوبست بھی کر سکتا تھا۔ وہ ایک عرصہ یورپی ممالک میں گزار کر پاکستان آتا ہے۔ اپنی سیر وسیاحت کی گزاری ہوئی زندگی کے باعث تھیم ریسٹورنٹ میں ملازمت اور اس نوع کے کام کرتا ہے۔ اس نے کچھ عرصہ پنجاب یونی ورسٹی کے سامنے ٹولنگٹن مارکیٹ میں واقع ایک ریستوران میں بھی ملازمت کی۔ جب بھی اُسے پاکستان لوٹنے کا پوچھا جاتا تو وہ اس بات کا سبب یہی بتاتا کہ اس کے قریبی رشتہ دار یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے جس کی وجہ سے وہ پاکستان واپس چلا آیا۔ حال آں کہ اس بات کا سبب کچھ اور تھا۔ اس نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے منشیات فروخت کرنی شروع کر دی۔ اُس کے کسی رشتہ دار نے اس بات کی مخبری کی اور وہ پکڑا گیا اور مستقلاً اُسے وہاں سے ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اسی لیے وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "ہم پاکستانیوں کو پردیس میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ رہتے ہوئے کسی دشمن کی ضرورت نہیں رہتی۔" وہ دوبارہ امریکہ ہی میں شفٹ ہو گیا۔ مصنف نے اپنے دوست کے ذریعے ہی بڑی ماموں کا ٹیلی فون تلاش کیا تو پتہ چلا کہ ایک حادثے کی وجہ سے اُس کی یادداشت متاثر ہو گئی ہے۔ پھر جب تصاویر کا تبادلہ ہوا تو اس نے قدرے تردد سے پہچان لیا۔ مزید یہ کہ اُس نے اپنا ایک ہوٹل بنا لیا تھا جو کرونا کی وجہ سے خسارے میں چل رہا تھا۔ اس نے واٹس اپ پر ایک اطالوی خوب رو مرد کی تصویر بھی بھیجی جس کے بعد وائس میسج میں بتایا کہ میرا آسٹریا والا بیٹا ہے جسے اُس کی منگیتر نے راضی کیا کہ وہ اپنے باپ کو ڈھونڈے اور دیکھے، وہ کس حالت میں ہے۔ یہاں آ کر خاکہ قارئین کو بھی گلوگیر کر دیتا ہے۔

"فون کی دوسری جانب سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں توقف کے بعد انھوں نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ اس کی منگیتر نے اسے مجبور کیا کہ وہ مجھے تلاش کرے۔ بیٹیاں باپوں کی اہمیت سمجھی ہیں۔ باپوں میں ان کی جانیں ہوتی ہیں۔ اس نے میرے بیٹے کو قائل کیا کہ وہ مجھ سے ملے کیوں کہ اپنا خون، اپنے جینز اپنے ہی ہوتے ہیں۔ منگیتر کے کہنے پر اُس نے مجھے تلاش کیا اور وہ دونوں مجھے ملنے مالدیپ آئے۔۔۔ میں اور میرا بیٹا بہت دیر تک گلے لگ کے روتے رہے۔ اُس کی منگیتر بھی روتی رہی۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ گھر چھوڑنے کے کئی سال بعد میں نے اُسے کپڑے بھیجے تھے۔ تب وہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

میرے ذہن میں ایک چھوٹا سا بچہ ہی تھا جب کہ حقیقت میں وہ ٹین ایجر ہو گیا تھا۔ وہ کپڑے اُسے چھوٹے تھے مگر اُس نے آج تک انھیں میری نشانی سمجھ کر سنبھالا ہوا ہے۔ میری آسٹرین بیوی نے کبھی دوبارہ شادی نہیں کی۔ ۱۳؎

ایک آزاد منش انسان کو آخر کار سمجھ آجاتی ہے کہ بیوی اور اولاد آخری عمر کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ یادیں سبھی سرمایہ ہوتی ہیں اگر یاد داشت چلی جائے تو وہ سرمایہ ضائع ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ اس زندگی میں محبت سے زیادہ عزت کرنے والا جیون ساتھی مل جائے تو پھر دُنیا میں اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

" بانسری بابا" اس کتاب کا چھٹا اور آخری خاکہ ہے جو مصنف کا گھریلو ملازم ہے۔ اس میں انسانوں سے محبت اور وفاداری کے ساتھ ساتھ اُس کی دیگر مخلوقات سے اُنس کا جذبہ قابلِ تعریف ہے۔ وہ عیسائی سے مسلمان ہوا تھا۔ اس کا صاحب خانہ سے تعارف بھی گھریلو ملازمہ اماں برکتے نے کروایا۔ اس کا ایک بیٹا اپاہج تھا۔ بیوی مختلف ادویات کو استعمال کرنے کی وجہ سے بیمار ہو کر آخرت سدھار گئی۔ اس نے آٹھ ہزار روپے کے عوض چنگڑ خاندان کی ایک لڑکی سے اپنے لختِ جگر کی شادی کر دی جو چند دن گزار کر اس کی جمع پونجی لوٹ کر رفو چکر ہو گئی۔ جب اُس کے خاندان کی تلاش کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ تو ایسے خاندانوں کا آئے دن کا معمول ہے لیکن اس خاندان کا کہیں سے پتہ نہ چلا اس طرح وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹے کی وفات پر اسے مقامی قبرستان میں مصنف کے رشتے کے ماموں جو بریگیڈیئر کے عہدے پر فائز تھے، کے برابر جگہ ملی تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جس کو دنیا کے باسی اکثر بھلا کر فرعون، شداد، نمرود اور اس نوع کے دیگر کرداروں کی ہم سری پر پھولے نہیں سماتے۔

"جب اس کا بیٹا اسلم فوت ہوا تو اُسے کیولری گراؤنڈ کے قبرستان میں بریگیڈیئر نعمت علی خان کی قبر کے برابر میں جگہ ملی۔ بریگیڈیئر صاحب رشتے میں ہمارے ماموں تھے اور ضیاء دور میں خاصی اہم پوسٹوں پر رہ کر سرطان کے باعث انتقال کر گئے تھے۔ جب اسلم کو اس کے برابر میں دفنایا گیا تو بابا اقبال نے آنسو بھری آنکھوں سے دونوں قبروں کو دیکھا اور آہ بھر کر پنجابی میں بولا۔ وقت کیسے بلند و پست کو برابر کر دیتا ہے۔ کہاں مجھ نمانے کا مفلوج بیٹا، کہاں جرنیل، کرنیل؟ آج سب برابر لیٹے ہیں۔ خدا سب کا بیلی ہو۔ ۱۴؎

اس کردار کی سب سے اہم خوبی انسانوں اور جانوروں سے بے پایاں محبت ہے۔ وہ ضرورت مندوں کی مدد اور جانوروں کے کھانے کا اہتمام کر کے دلی خوشی محسوس کرتا۔ وہ نہ صرف عارفانہ کلام پڑھتا بل کہ انسانیت کی خدمت میں بھی پیش پیش رہتا۔ یہی بے لوث محبت تھی جو کسی کے دل میں مستقل گھر کر کے اس کی یادوں میں بسیرا کر لیتی ہے۔ اسی کی بہ دولت لوگوں کو دائمی اور ہمیشہ کی زندگی عطا ہوتی ہے عموماً گھریلو ملازم کی موت پر یوں افسوس نہ کیا جاتا ہو جیسے اپنے قریبی عزیز یا رشتہ دار کی دُنیا سے روانگی غم والم سے دوچار کر جاتی ہے۔ جب مصنف کی والدہ بابا اقبال کی موت کا بتاتی ہے تو دن بھر کی مصروفیت کی وجہ سے وہ صدمہ دبا رہا اور رات کو" اندر واندری واگدا رہند اپانی درد حیاتی دا" کے مصداق غم نے بغیر کلام کے آنکھوں سے اظہار کی صورت پائی۔ اس ضمن میں مصنف لکھتے ہیں:

"رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، نہ جانے اتنے آنسو لگا تار کہاں سے آرہے تھے کہ مسلسل بہے جاتے تھے۔ آنکھیں پونچھتا تو پھر سے بھر آتیں۔ مجھے حیرت تھی کہ جب مجھے اتنا دکھ نہیں تھا تو آنسو کیوں رک نہیں رہے تھے۔ میں نے آدھی رات کو اٹھ کر آئینے میں دیکھا تو سُوجی سُوجی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں رات بھر جاگتا رہا۔" ۱۵؎

عرفان جاوید کی اس کتاب میں شامل خاکوں میں جہاں ان کرداروں کے عادت واطوار، رویے، باہمی تعاون، رنگارنگ مزاج اور ان کی سوچوں کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کرداروں کی زندگی کی جزئیات کا بھی علم ہوتا ہے جیسے وہ بروئے کار لا کر ان خاکوں میں حقیقت نگاری کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ قاری جہاں ان کی جزئیات نگاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتا وہاں وہ ان کے منفرد، دل کش اور دل آویز بیانیے پر بھی پھڑک اٹھتا ہے۔ خاکہ نگاری کے باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جو باتیں تحریر کی تھیں زیرک قاری ان کے افسانے میں انھیں بہ نفسِ نفیس ملاحظہ کر سکتا ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

"انگریزیSketch کے لیے مستعمل اصطلاح خاکہ اس مختصر تحریر کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی فرد کے بارے میں شخصی تعلقات، نجی کوائف اور ذاتی احوال پر مبنی ہو۔ اسے شخصیت نگاری کی مختصر ترین صورت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر سوانح عمری ناول ہے تو پھر خاکہ کو مختصر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر پینٹنگ کی اصطلاح میں بات کریں تو خاکہMioniature کے مماثل نظر آتا ہے۔"۱۶

عرفان جاوید کے خاکوں میں افسانوی چاشنی، جاسوسی ناولوں جیسی سنسنی اور انشائیہ کی طرز کی زبان اور شعری فن پاروں جیسی دل کشی موجود ہے۔ ان خاکوں کو جو بھی ایک بار پڑھنا شروع کر دیتا ہے وہ نہ صرف اس تحریر سے مسحور ہو کر خود بہ خود کتابی خاکوں کے سنگ میل پار کرتے ہوئے اس کی اختتامی منزل مقصود پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ اگر کوئی پوچھ لے کہ کیا ہوا ہے تو بتائے نہ بنے۔ بہ قول شمیم حنفی:

"عرفان جاوید کے تحریر کردہ خاکوں نے مجھ پر جادو اثر کیا ہے۔"۱۷

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.3 2023

حوالہ جات

۱۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، تعبیرِ حرف، فیصل آباد: مثال پبلیشرز، ۲۰۱۴ء ص: ۳۱۳

۲ - انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: اے۔ ایچ پبلیشرز طبع اوّل اپریل 1996ء، ص: ۵۸۹

۳۔ حسن کاظمی ، تبصرہ مجھے توحیران کر گیا وہ، از احمد عقیل روبی، لاہور: دی پر فیکشنٹس، اشاعت اوّل ۲۰۰۹ء، بیک فلیپ

۴۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اُردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء ص: ۲۳۲

۵۔ عرفان جاوید، آدمی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص: 41-40

۶۔ ایضاً، ص: ۴۲

۷۔ رحمان فارس، عشق بخیر لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص: ۳۵

۸۔ عرفان جاوید، آدمی، ص: 47

۹۔ ایضاً، ص: 159

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۵۶۔۱۵۵

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۷۰

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۹۲

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۳۲

۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۵۳

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، توضیحی لغت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱، ص: ۱۱۷

۱۷۔ عرفان جاوید، آدمی، بیک فلیپ